شرح
کلامِ غالبؔ
(ردیف واوٗ)
ڈاکٹر محمد شرف الدّین ساحلؔ
ناشر
انتخاب پبلشنگ ہاؤس
مومن پورہ ناگپور ۱۸ (مہاراشٹرا)
☎ : 721069

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرحِ

# کلامِ غالب

## ردیف واوٗ


شارح

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ



انتخاب پبلشنگ ہاؤس

مومن پورہ ۔ ناگپور ۱۸ (مہاراشٹر)

فون نمبر ۷۲۱۰۶۹

کتاب کا نام : شرحِ کلامِ غالب (ردیف واؤ)

شارح کا نام : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ

ناشر : انتخاب پبلشنگ ھاؤس
مومن پورہ، ناگپور

سالِ اشاعت : باردوم مارچ ۱۹۹۶ء

طباعت : اصغر فائن آرٹس
جامع مسجد، مومن پورہ، ناگپور ۴۴۰۰۱۸

: پندرہ روپے صرف

تقسیم کار
صالحہ بک ٹریڈرس اینڈ اسٹیشنرس
جامع مسجد، مومن پورہ، ناگپور ۱۸

فون نمبر ۷۲۱۰۶۹

# مرزا غالب

## حیات و شاعری

غالب اردو غزل میں جدتِ تخیل کے بانی ہیں۔ انہوں نے غزل کو نیا لب و لہجہ اور آہنگ دیا اور اس کے مضامین میں وسعت و تنوع پیدا کیا۔

انکا سلسلۂ نسب توران ابن فریدون سے ملتا ہے۔ ان کے پردادا ترسم خان تھے۔ ان کے دادا قوقان بیگ خان، محمد شاہ کے عہدِ حکومت میں سمرقند سے ہندوستان آئے۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اس کی وفات کے بعد دہلی پہنچے اور مرزا نجف خان کی سرکار سے وابستہ ہوگئے۔ انہی کے ذریعے مغل بادشاہ شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے۔ لیکن جب سلطنتِ مغلیہ کو زوال ہونے لگا تو ملازمت ترک کرکے مہاراجہ جے پور کی سرکار سے وابستہ ہوگئے اور دہلی سے نقلِ مکانی کرکے آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے صرف دو بیٹوں کے نام محفوظ رہ گئے ہیں۔ مرزا عبداللہ بیگ خان اور مرزا نصراللہ بیگ خان۔ یہی مرزا عبداللہ بیگ خان غالب کے والد تھے۔

مرزا عبداللہ بیگ خان اپنے والد قوقان بیگ خان کی زندگی میں فکرِ معاش سے آزاد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جب انہیں معاش کی فکر ہوئی تو لکھنؤ جاکر

نواب آصف الدولہ کی سرکار میں نوکری کی۔ پھر چند روز بعد نظب نظام علی خان والیٔ حیدرآباد کے یہاں چار سو کی جمعیت سے کئی برس ملازم رہے۔ جب یہ نوکری خانہ جنگی کی وجہ سے جاتی رہی تو راؤ راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور کے یہاں ملازمت اختیار کی اور ۱۸۰۲ء میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔

ان کی شادی آگرہ میں خواجہ مرزا غلام حسین کی بیٹی عزت النسا بیگم سے ہوئی تھی۔ غالب انہیں کے بطن سے ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو بدھ کے دن آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خان اور عرف مرزا نوشہ تھا۔ چوں کہ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خان نے ان کی پرورش کی۔ مرزا نصر اللہ بیگ لاولد تھے اور انگریزی فوج میں ملازم تھے اس لیے ان کی مالی حالت اچھی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف علی کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح بڑے ہی ناز و نعم سے پالا لیکن افسوس کہ پانچ سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح غالب اور ان کا خاندان بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔

یہ دیکھ کر نواب احمد بخش خان (والیٔ لوہارو) کو جن کی بہن غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خان سے بیاہی تھی غالب اور ان کے چھوٹے بھائی پر خاص طور سے رحم آیا اور انہوں نے لارڈ لیک سے سفارش کر کے دونوں بھائیوں کے لیے سات سو پچاس روپے سالانہ وظیفے کا انتظام کروا دیا۔ یہ وظیفہ ۱۸۵۰ء تک ملتا رہا۔

مرزا غالب نے فارسی کی ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی اور ایک نومسلم ایرانی عالم ملا عبد الصمد سے اس کا تکملہ کیا ابھی ان کی عمر تیرہ سال ہی تھی کہ ۱۸۱۰ء میں ان کی شادی نواب احمد بخش خان

(والیِ لوہارو) کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے کردی گئی۔ انہوں نے شادی کے بعد ۱۸۱۲ء میں آگرہ کو خیرباد کہا اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

غالب فقط شاعر تھے۔ وہ کسی کام کے نہ تھے۔ انگریزوں نے ان کے بچپن میں جو پنشن مقرر کردی تھی وہی ان کا سہارا تھی۔ لیکن جب اخراجات بڑھنے لگے تو وہ مقروض ہوتے چلے گئے۔ اس قرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنی پنشن میں اضافے کی کوشش شروع کی۔ چوں کہ کلکتہ اس زمانے میں انگریزوں کا مرکز تھا اس لیے وہ خود اپنا مقدمہ لے کر ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور فرخ آباد، کانپور، لکھنو، باندہ ہوتے ہوئے ۱۲ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ وہاں ڈیڑھ سال سے زائد عرصے تک قیام کیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا چنانچہ ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس دہلی آگئے۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی میں ریذیڈنٹ کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا جس کا فیصلہ ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو یہ ہوا کہ جو پنشن انہیں ملتی ہے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس فیصلے کے بعد بھی وہ خاموش نہیں رہے بلکہ کوشش کرکے اپنا مقدمہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس ولایت بھجوایا۔ لیکن ۱۸۴۲ء کی ابتدا میں یہ آخری فیصلہ بھی ان کے خلاف ہوگیا۔ اس فیصلے کے خلاف پھر ایک اپیل ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں کی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور اس طرح وہ ۱۸۴۴ء میں خاموش ہوکر بیٹھ گئے۔

ایسے حوصلہ شکن حالات میں انہیں ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن اپنی تنک مزاجی کے باعث اسے منظور کرنے سے انکار کردیا۔ ہوا یہ کہ جب حکومت ہند کے سکریٹری جیمس ٹامس نے انہیں اس عہدے پر تقرر کرنے کے لیے بلوایا اور یہ بنگلے پر پہنچنے کے بعد ان کی پذیرائی نہیں کی گئی تو وہ برانگیختہ ہوگئے اور مسٹر ٹامس سے یہ کہہ کر واپس چلے آئے کہ "ملازمت اس

یہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے عزو وقار میں اضافہ ہو نہ کہ جو پہلے سے ہے اس میں بھی کمی آجائے ۔ اگر ملازمت کے معنی موجودہ رتبے میں بھی کمی کے ہیں تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے ۔"

لیکن عزت بہر حال عزت ہے ۔ خودداری اور انا سے انسان کا پیٹ بھرنا مشکل ہے ۔ لہٰذا ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ مجبور ہوگئے اور اپنے قریبی دوستوں کے کہنے پر قلعہ کی ملازمت پر اپنی آمادگی کا اظہار کر ہی دیا ۔
چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں (مدار المہام) اور مولانا نصیر الدین (عرف میاں کالے) کی سفارش پر بہادر شاہ ظفر نے انہیں ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کا خطاب عطا کیا اور چھ پارچے اور تین جواہر کا خلعت پہنایا ۔
پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی اور انہیں خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے کی ذمہ داری سونپی ۔ چار سال بعد ۱۸۵۴ء میں ولی عہد سلطنت مرزا فخر الدین رمز بھی ان کے شاگرد ہوگئے ۔ انہوں نے چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی ۔ اسی سال ذوق نے وفات پائی تو بہادر شاہ ظفر بھی ان سے اصلاح لینے لگے اور غالباً اسی سال لکھنؤ کے نواب، واجد علی شاہ کی طرف سے پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہوئے ۔ اس طرح انہیں آرام و آسائش کے دن میسر آئے ۔
لیکن ان کی یہ خوش حالی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی اس لیے کہ دو سال کے بعد ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو" نے انتقال کیا ۔ ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور پھر مئی ۱۸۵۷ء میں غدر ہوگیا جس کے بعد سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا ۔
اب انہوں نے غدر کے بعد نواب یوسف علی خاں ناظم (والیِ رامپور) کی طرف اپنا رخ کیا تمامی سفارش و کوشش کے بعد ۱۶ جولائی ۱۸۵۹ء کو نواب رامپور نے ان کے لیے سو روپے ماہانہ مقرر کر دیے ۔ پھر وہ نواب صاحب کی دعوت پر جنوری ۱۸۶۰ء میں پہلی بار رامپور گئے ۔ وہاں تین ماہ قیام کرنے

کے بعد مارچ میں دہلی آئے۔ اس کے بعد انہوں نے نواب یوسف علی خان کے انتقال کے بعد اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور کا دوسرا سفر کیا۔ اس سفر کا مقصد مرحوم کی تعزیت اور نئے نواب، کلب علی خان کی خدمت میں تہنیت پیش کرنا تھا۔ وہ اس سفر سے ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی واپس آئے۔

اس کے بعد ان کی زندگی مسلسل بیماری میں گزری اور پھر یہ حال ہوا کہ ان کا چلنا پھرنا تک موقوف ہوگیا تھا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے اپنی ضروریات پوری کرتے۔ یہی تکلیف کیا کم تھی کہ ایک دن اچانک دماغ پر فالج گرا اور اسی حالت میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ بستی نظام الدین (دہلی) میں خاندان لوہارو کے قبرستان میں ان کا مزار ہے۔

غالب آزاد خیال، خوددار، رندمشرب اور احباب نواز تھے۔ اگرچہ طبیعت حساس پائی تھی پھر بھی ان کی فطرت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی یہاں تک کہ ان کی کوئی بات لطیفے سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ وہ وسیع النظر تھے اس لیے ہر ایک کے جذبے کا بھرپور احترام کیا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے وفا اور ان پر جان چھڑکنا ان کا ایمان تھا۔

ان کی شاعری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس وقت ان کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ ذہین وطباع تھے اس لیے بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے تقریباً دو ہزار اشعار کہہ ڈالے۔ یہ ان کی ابتدائی مشق تھی لہٰذا اس دیوان کو نظری کر دیا۔ اس کے بعد اپنی خداداد صلاحیت اور دور اندیش نگاہ کو کام میں لاکر ان اشعار کی تخلیق کی جو آج تک اردو ادب کے شاہکار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی میں بھی طبع آزمائی شروع کی ایک دیوان ترتیب دیا۔ اس زبان میں خطوط بھی لکھے۔ اخیر زمانے میں جب فارسی کی جگہ اردو نے مکمل طور پر لے لی تو اردو مکتوب نگاری کی طرف متوجہ

ہوئے اور اس میں وہ "طرزِ خاص" ایجاد کیا جس کی آج تک کوئی تقلید نہ کر سکا۔ انہوں نے اپنے پیچھے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان میں ان کے اردو اور فارسی دیوان کے علاوہ مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، دعائے صباح عودِ ہندی (اردو خطوط کا مجموعہ) اور اردوئے معلّی (اردو خطوط کا مجموعہ) قابلِ ذکر ہیں۔

غالب اردو غزل کا وہ مایۂ ناز شاعر ہے جس نے اردو غزل کے مضامین میں وسعت و کشادگی پیدا کی۔ اسے نیا ذہن دیا اور نئے نئے موضوعات سے آشنا کرایا۔ حالانکہ وہ فارسی شاعری کے مقابلے میں اپنی اردو شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ اپنے اردو کلام ہی کی وجہ سے دنیائے شعر و ادب میں بے انتہا مقبول ہوئے۔

غالب کی شاعری اردو شاعری کی تاریخ کا وہ نقطہ ہے جہاں سے روایت کی ڈھلوان شروع ہوتی ہے اور جدیدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ غالب سے پہلے ہماری شاعری محض عشقیہ مضامین کی پابند تھی اور اس میں سوائے محبوب کی سراپا نگاری کے کچھ نہ تھا۔ غالب نے اس جمود کو اپنی پوری قوت سے توڑا اور اس میں متعدد نئے موضوعات و مضامین کو داخل کیا۔ ان نئے تجربات کی وجہ سے ان کے کلام میں نہ صرف انفرادی رنگ پیدا ہو گیا بلکہ وہ زمانے کی قید سے بھی باہر ہو گیا۔

لیکن ان کے یہاں یہ خوبی اور انفرادیت بتدریج آئی ہے۔ وہ ابتدا میں بہت ہی مشکل پسند تھے۔ زیادہ تر خیالی مضامین باندھا کرتے تھے اور فارسی کے مشہور شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کی تقلید کی دھن میں فارسی کی بھاری

بھر کم ترکیبوں سے کام لیا کرتے تھے۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں کافی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ وہ لطفِ زبان، شعریت اور حسنِ ادا سے بھی خالی ہیں۔ اس لیے ان کا مفہوم سمجھنے کے لیے کافی دماغی ورزش کرنی پڑتی ہے مثال دیکھیے:

نظارہ میں میری شکل سے افسوس کے نشاں
چون شانہ پشت دست بدنداں گزیدہ ہوں

---

چشم بندِ خلق جز تمثال خود بینی نہیں
آئینہ ہے قالبِ خشتِ در و دیوارِ دوست

اس کے بعد انہوں نے خیال مضامین اور مشکل پسندی سے انحراف کر کے زندگی کے حقائق کی طرف توجہ دی اور انسانی فطرت کو اپنے شعروں میں سمویا۔ اس دور میں ان کے یہاں فارسی کی بھاری بھر کم تراکیب اور نامانوس الفاظ کا زور ٹوٹا اور اس کی جگہ فارسی کی آسان ترکیبوں نے لی اب وہ اس قسم کے شعر کہنے لگے:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

---

بے سنگ پہ برات معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

---

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

پھر وہ رفتہ رفتہ سہلِ ممتنع کی طرف مائل ہوئے اور اس راستے کو چھوڑ کر ایک نئے راستے کا انتخاب کیا۔ یہیں سے ان کی زبان میں لطف، ان کے اندازِ بیان

میں پختگی اور ان کے لہجے میں طنز، شوخی اور ظرافت آئی۔ اب روزمرہ اور محاروں کا استعمال بھی ہونے لگا اور اشعار میں نئے نئے مضامین راہ پانے لگے۔ اس منزل پر پہنچ کر انہوں نے اپنی فکر اور انا کے بل بوتے پر ایسے صاف ستھرے اور لطیف اشعار نکالے ہیں کہ اپنے ہم عصروں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور وہ آج کے دور کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

---

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

---

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

---

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اس دور میں انہوں نے بیشتر صاف ستھری اور عام فہم غزلیں کہی ہیں۔ اس طرح ان کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کا فن اس قدر نکھرا کہ وہی ان کی شناخت بن گیا۔ فکری لحاظ سے ان کے یہاں ہر طرح کے موضوعات و مضامین ملتے ہیں۔ فلسفہ و تصوف کے رموز و نکات، غم کی حرارت، زندگی کے مسائل، فنا و بقا کی تشریح توحید کی تفہیم، عشق و محبت کی لذت، شوخی و ظرافت، سوز و گداز۔ یہ سب کچھ ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جدتِ تخیل، جدتِ محاکات، جدتِ الفاظ، جدتِ مضامین، جدتِ بیان اور جدتِ تشبیہات و استعارات

کا بھی ان کی شاعری انمول خزینہ ہے۔ پھر ان کے یہاں استدلالی اندازِ بیان اور استفہامیہ لہجہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں انسانی نفسیات کی عکاسی بھی بڑی کامیابی سے کی ہے اور بڑے سے بڑے مضمون کو نہایت اختصار سے ایک شعر میں نظم کر دیا ہے۔ رمزیت اور ایمائیت جو غزل کے بنیادی لوازم ہیں وہ بھی ان کی غزلوں میں بدرجۂ احسن پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے شعروں میں دو ایک باتیں ایسی چھوڑ دیتے ہیں جن کو پڑھنے والا اپنی طرف سے پورا نہیں کرتا بلکہ ان کے اس قسم کے اشعار میں ہی چند الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اس کو شعر کے مفہوم تک پہنچانے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں چند اشعار قلم بند کیے جاتے ہیں جن میں کم و بیش یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

---

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے | دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
موت کا ایک دن معین ہے | نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
ہے خبر گرم ان کے آنے کی | آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

---

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

---

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہارے شرابِ طہور کی

---

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

---

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غرض غالب اردو غزل کا ایک ایسا شاعر ہے جس نے اپنی فکر سے اردو شاعری کو اس بلندی پر پہنچایا جہاں کسی دوسرے شاعر کا دم مارنا انتہائی مشکل ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

# شرح کلامِ غالب

## (ردیف واؤ)

## ۱

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

| | |
|---|---|
| حسد | = رشک، جلن |
| افسردہ | = مرجھایا ہوا |
| گرم تماشا ہو | = طرح طرح کے مناظر دیکھ |
| چشمِ تنگ | = تنگ نظر، محدود نظر |
| کثرتِ نظارہ | = دیکھنے کی کثرت |
| وا ہو | = کشادہ ہو، کھلے |

مطلب ـــــ یہ ایک روشن اور مسلم حقیقت ہے کہ انسان جس محدود مقام پر رہ کر اپنی زندگی گزارتا ہے، وہ اسی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہے اور اسی معیار پر دوسروں کے مقابلے میں اپنی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ اس کی محدود دنیا سے باہر کیا ترقی ہو رہی ہے یا کیسے کیسے لعل و جواہر بکھرے ہوئے ہیں۔

اس لیے غالب کہتے ہیں کہ محدود دنیا کا یہ مشاہدہ اور تجربہ در اصل تنگ نظری کی دلیل ہے۔ اسی تنگ نظری کی وجہ سے انسان میں حسد کے مہلک جراثیم پیدا ہوتے ہیں جو اس کے دل کو پژمردہ کر دیتے ہیں لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی محدود دنیا سے باہر آنکھیں کھول کر تمام دنیا کے حالات کو دیکھے اور طرح طرح کے مناظر کی سیر کرے۔ شاید اس عمل سے اس کی تنگ نظری کشادہ نظری میں بدل جائے۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفتِ دریا ہو

بقدرِ حسرتِ دل ۔ دل کی آرزو کے برابر
ذوقِ معاصی ۔ گناہوں کا ذوق
یک گوشۂ دامن ۔ دامن کا ایک کونا
آبِ ہفت دریا ۔ سات دریاؤں کا پانی

مطلب: ـــــ اس شعر میں غالب نے اپنے ذوقِ معاصی کا مقابلہ دنیا کے گناہوں سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری حسرتِ گناہ کے مقابلے میں دنیا کے گناہ اس قدر کم ہیں کہ اس کے سات دریاؤں کا پانی میرے دامن کے ایک ہی گوشے میں سما سکتا ہے اس لیے تھوڑے سے گناہوں کے لیے میں اپنے دامن کو داغدار کیوں کروں۔ اگر میرے دل کی آرزوؤں کے برابر گناہ ہوں تو گناہ کرنے میں مزہ ہے۔ اسی مفہوم کو غالب نے ایک جگہ اس طرح ادا کیا ہے:
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۔ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

---

اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز، آ جائے
کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

سرو قد ۔ سیدھے قد والا
سرو ایک درخت کا نام ہے جو سیدھا اگتا ہے اس لیے شعرا معشوق کے قد کو اسی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چوں کہ قمری سرو کی عاشق ہوتی ہے اس لیے اس شعر میں رعایتِ لفظی سے کام لے کر سرو قد باندھا ہے۔
گرمِ خرامِ ناز ۔ ناز و انداز سے چلنے والا
کفِ ہر خاکِ گلشن ۔ باغ کی مٹی کی ہتھیلی (یہاں باغ کے ذرّے ذرّے سے مراد ہے)

شکلِ قمری = قمری کی طرح

قمری ایک پرندے کا نام ہے جو سرو کی عاشق ہوتی ہے

نالہ فرسا ہو = نالہ و فریاد کرنے لگے

مطلب: ـــــــ اگر وہ معشوق جس کا قد سرو کی طرح سیدھا ہے اور جو ناز و انداز سے چلنے والا ہے، گلشن میں آجائے تو گلشن کا ذرہ ذرہ اس کا اسی طرح عاشق ہوجائے جس طرح قمری سرو پر عاشق ہوتی ہے اور اس کے عشق میں چور ہوکر نالہ و فریاد کرنے لگتی ہے۔

ـــــــ ۲ ـــــــ

کعبے کو جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

کنشت = یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہ، آتش کدہ، بت خانہ

مطلب: ـــــــ اگر میں کافر سے مسلمان ہوگیا ہوں اور بت خانے کو چھوڑ کر کعبہ میں مقیم ہوگیا ہوں تو اے دوستوں! تم میری اس تبدیلی پر مجھکو طعنہ مت دو اس لیے کہ میں نے بت پرستوں کے حقِ صحبت کو کعبہ میں مقیم ہونے کے باوجود بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ مجھ کو ان کی تمام باتیں خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ میں آج بھی ان کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتا ہوں۔

ـــــــ

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

طاعت = عبادت و بندگی

تا = تاکہ

مے و انگبیں = شراب اور شہد

(یہ دونوں چیزیں جنت میں جنتیوں کو ملیں گی)

لاگ = لالچ، ہوس

بہشت = جنت

مطلب: ـــــ اس شعر کا مفہوم اس واقعے کی روشنی میں پوری طرح واضح ہوجاتا ہے ـــــ ایک روز حضرت رابعہ بصریؒ ایک ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے کر پورے جوش و جذبے کے ساتھ اٹھیں۔ جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ محترمہ کہاں کا ارادہ ہے تو کہنے لگیں کہ آج جی چاہتا ہے کہ اس چراغ کی آگ سے جنت کو آگ لگا دوں اور اس لوٹے کے پانی سے دوزخ کی آگ کو بجھا دوں تاکہ جنت اور دوزخ کا قصہ ہی تمام ہوجائے اور لوگ خلوص دل سے خدا کی عبادت و بندگی کرنے لگیں۔

غالب نے بھی اس شعر میں اسی خلوص کی دعوت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کاش کوئی بندۂ حق ایسا ہوتا جو جنت کو دوزخ کی آگ میں ڈال کر راکھ کر دیتا تاکہ لوگ خلوص دل سے خدا کی عبادت کرتے اور انہیں یہ لالچ اور ہوس نہ ہوتی کہ عبادت و بندگی کے بعد انہیں جنت ملے گی اور جنت میں شرابا طہورا پینے کو اور شہد کھانے کو ملے گا۔

---

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

منحرف = پھر جانا، بدل جانا

رہ و رسمِ ثواب = ثواب کے رسم و راستے یعنی تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی

قلمِ سرنوشت = وہ قلم جس سے تقدیر لکھی گئی ہے

مطلب: ـــــ غالب کہتے ہیں کہ میں رہ و رسمِ ثواب سے انحراف

کیوں نہ کردں یعنی تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی کیوں اختیار کردں جبکہ اس قلم کا قط ہی ٹیڑھا ہے جس سے میری تقدیر لکھی گئی ہے۔ میں تقویٰ و پرہیزگاری کے راستے پر کیوں چل سکتا ہوں جبکہ میری تقدیر میں یہ بات لکھی ہی نہیں گئی کہ میں اس راستے کو اختیار کردں۔ چوں کہ تقدیر کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا اس لیے ثواب کے راستوں پر میرا چلنا ممکن نہیں ہے۔ میں نوشتۂ تقدیر کے مطابق ان راستوں سے ہمیشہ انحراف ہی کرتا رہوں گا۔

---

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

سعی = کوشش

لہنا = یہ اردو کا ایک خاص لفظ ہے جو دلی اور اس کے اطراف میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی فائدہ، پھل یا ثمرۂ ریاضت کے ہیں۔

خرمن = غلے کے اس انبار کو کہتے ہیں جس سے بھوسہ الگ نہ کیا گیا ہو اور کھیت سے لا کر ایک جگہ رکھ دیا گیا ہو۔

ملخ = ٹڈی (اس پرندے کا دَل جس کھیت پر بیٹھتا ہے، اسے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔)

کشت = کھیتی

مطلب : ______ اس شعر میں غالب نے اپنی ازلی بدنصیبی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو میری کوششوں کا اب تک کوئی صلا نہیں ملا۔ میری بدنصیبی کا یہ عالم ہے کہ اگر میری کھیتی "ٹڈی دل" سے محفوظ رہ جاتی ہے تو اس وقت تباہ و برباد ہو جاتی ہے جب خرمن کی شکل اختیار کرتی ہے۔ افسوس میری تمام محنتوں کے

حاصل خرمن پر اچانک بجلی گر پڑتی ہے اور وہ اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

۳

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

وارستہ = بے نیاز، بے فکر، آزاد

مطلب : ـــــ کہتے ہیں کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ ہمارے ساتھ محبت ہی کریں۔ دراصل اب تو ہم اس سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ہمارا مدعا صرف اتنا ہے کہ آپ ہم سے محبت نہیں کرتے تو نہ سہی، کم سے کم عداوت (دشمنی) تو کیجیے تاکہ ہمارا آپ سے تعلق قائم رہ سکے۔ اسی مضمون کو ایک دوسرے شعر میں یوں باندھا ہے :

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ✽ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

---

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ، اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

اختلاط = میل جول

مطلب : ـــــ میں اس قدر کمزور ہو چکا ہوں کہ اب مجھ میں کسی سے میل جول رکھنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ میری جسمانی کمزوری کا یہ حال ہے کہ نقشِ محبت جیسی لطیف، بے وزن اور نازک شے کو بھی میرا دل برداشت نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں مبالغہ ہے۔ غالب نے اپنے ضعف کی تصویرکشی میں کمال کیا ہے۔

---

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

مطلب: ـــــــ اس شعر میں غالب نے رقیب کے متعلق اپنا خیال پیش کیا ہے۔ انہیں یہ بات مطلق گوارا نہیں ہے کہ محبوب کی زبان پر اس کا نام تک آئے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ تو نے میرے سامنے رقیب کی برائیاں بیان کی ہیں۔ شکایت کے لہجے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر بھی یہ بات میری برداشت سے باہر ہے کہ رقیب کا نام تیری زبان پر آئے۔ اس نے مجھ کو تجھ سے یہ شکایت ہے کہ تیری زبان پر رقیب کا نام کیوں آیا۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

چارۂ غمِ الفت = محبت کے غم کا علاج

مطلب: ـــــــ ایسا کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر مرض کا علاج موجود ہے ہر درد کی دوا ہے۔ لیکن یہ بات سراسر لغو اور بے بنیاد ہے اس لیے کہ آج تک محبت کے غم کا علاج کسی سے نہ ہو سکا۔ اگر ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے تو محبت کے غم کی دوا دنیا میں کیوں نہیں ملتی۔ لہٰذا اس روشنی میں یہ دعویٰ جھوٹا قرار پاتا ہے کہ ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔

---

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

اپنے سے خجالت کھینچتا ہوں = یہ فارسی محاورہ "از خود خجالت ہی کشم" کا ترجمہ ہے اور موجودہ اردو میں غیر فصیح قرار پایا ہے اس کا مطلب ہے خود اپنی ہی ذات سے شرمندہ ہونا۔

مطلب: ـــــــ غالب کسی کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کرتے۔ اس

معاملے میں وہ خود دار اور انا پسند ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں: میں اپنی غربت و بے کسی کا احسان مند ہوں کہ اس نے مجھے دوسروں کا احسان اٹھانے سے بچا لیا۔ میری غربت کی وجہ سے کوئی مجھ تک آیا ہی نہیں تو مجھ پر احسان کون کرتا اور نہ ہی مجبور ہو کر میں نے کسی کے آگے اپنا ہاتھ پھیلایا۔ اس طرح میں نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا ہے بلکہ میں نے خود اپنی ہی ذات پر احسان کیا ہے۔ چوں کہ بے کسی کی یہ شرم و حیا میری ذات تک محدود ہے اس لیے مجھ کو شرمندگی بھی ہے تو خود اپنی ہی ذات سے ہے، دوسروں سے نہیں۔

---

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

محشرِ خیال = خیال کا ہنگامہ یا ہجوم
خلوت = تنہائی

مطلب: ——— یہ ایک سچائی ہے کہ انسان ہمیشہ افکار و خیالات میں ڈوبا رہتا ہے۔ وہ چاہے دوستوں کے مجمع میں ہو یا تنہائی میں اس کے دماغ میں سوچ اور تصورات کا ایک سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے غالب کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تنہائی میں بیٹھا ہوا نظر آئے تو اسے تنہا مت سمجھیے کیونکہ وہ خیالات کے ہنگاموں میں گھرا ہوا ہے۔ اس طرح وہ خلوت میں نہیں بلکہ انجمن میں ہے۔ وہ تصورات کے اس قید خانے میں مقید ہے جہاں سے اس کا رہا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ابھی ایک خیال آیا ہی ہے کہ دوسرا اس کے سر پر سوار ہو گیا۔ ایک تصور سے نجات نہیں ملی کہ دوسرا تصور سامنے موجود ہے۔ سوچ کا یہ سلسلہ انسان کے دماغ میں ہر لمحہ جاری و ساری رہتا ہے۔

---

"ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامہ زبونیِ ہمت = پست ہمتی کی دلیل
انفعال = شرمندگی
دہر = دنیا

مطلب: ـــــ شرمندگی پست ہمتی کی دلیل ہوتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ کسی کا احسان مت اٹھائیے۔ کیوں کہ اگر تم کسی کا احسان اٹھاؤ گے تو ہمیشہ اس کے آگے شرمندہ ہی ہونا پڑے گا اور اس کے نتیجے میں تمہاری ہمت پست ہو کر رہ جائے گی۔ اگر دنیا میں رہنا ہے تو خوددار بن کر رہو۔ اپنی ہمت، حوصلے اور ارادے کے بھروسے پر زندگی گزارو۔ یہاں تک کہ عبرت جیسی غیر مادی چیز بھی دنیا یا اہلِ دنیا سے حاصل مت کرو۔ ورنہ یہ سوچ کر ہمیشہ شرمندگی اٹھانی پڑے گی کہ میں نے دنیا یا اہلِ دنیا سے عبرت حاصل کی ہے۔

---

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی = آزادی، بے نیازی
بیگانگی = بے تعلقی
وحشت = نفرت

مطلب: ـــــ آزادی یا بے نیازی اس کو نہیں کہتے کہ دنیا والوں سے تعلق توڑ کر تنہائی کا گوشہ اختیار کیا جائے، جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ اصل میں آزادی اور بے نیازی تو اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے آپ سے نفرت کرے اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کی ہرگز تکمیل نہ کرے

---

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

فوتِ فرصتِ ہستی = عمر کی مدت کا ضائع ہونا، عرصۂ حیات کا گزر جانا

صرفِ عبادت = عبادت و بندگی میں گزرنا

مطلب: ــــــ ہر انسان کی کم و بیش یہ فطرت ہے کہ جب اس کی عمر گزر جاتی ہے اور وہ مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اپنے ماضی کو یاد کر کے افسوس کرتا ہے اور یہی کہتا ہے میں نے اپنی تمام عمر یونہی گزار دی۔ زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ ایک متقی اور پرہیزگار شخص کے لب پر بھی یہی الفاظ آتے ہیں کہ میں نے تمام عمر عبادت ہی میں گزار دی۔ کاش کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی کام انجام دیتا۔ غرض کہ عرصۂ حیات گزر جانے کا غم ہر شخص کے ساتھ ہے۔ امیر ہو یا غریب رند ہو یا متقی ہر ایک کے دل میں یہ غم پایا جاتا ہے۔

---

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مطلب: ــــــ ہم اس فتنہ خو (یعنی اپنے محبوب) کے در سے ہرگز نہیں اٹھیں گے۔ اس لیے کہ ہم ہر آفت و مصیبت کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اگر ہمارے سر پر قیامت بھی ٹوٹ پڑے تو ہم اس کو ہنسی خوشی سے برداشت کر لیں گے۔

ــــــ ۲ ــــــ

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

قفس = پنجرہ (قید)

شیون = نالہ و فریاد
نوا سنجانِ گلشن = باغ کے چہچہانے والے پرندے

مطلب: ——— اگرچہ میں قفس میں قید ہوں اس کے باوجود بھی باغ کے چہچہانے والے پرندوں کو میرا نالہ و شیون برا معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ انہیں میرے اس نالہ و شیون سے ہرگز ناراض ہونا نہیں چاہیے اس لیے کہ میں قید ہوں اور وہ آزاد ہیں۔ پھر میری آہ و زاری ان کی آزادی میں رکاوٹ کا سبب بھی نہیں ہے۔ گویا گلشن میں میری ذات سے ان کو نقصان بھی نہیں پہنچ رہا ہے۔ کہیں ناراضگی کا یہ سبب تو نہیں کہ میرا شیون ان کی نوا سنجی سے پُرتاثیر ہے۔

---

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا، آرزوئے دوست دشمن کو

ہمدمی = ملاقات

مطلب: ——— یہ بات سچ ہے کہ میرا رقیب میرے محبوب سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن اے خدا مجھ کو تجھ سے یہ شکایت ہے کہ تو نے اس کے دل میں محبوب سے ملنے کی آرزو ہی کیوں پیدا کی۔ یہی غم مجھ کو کھا رہا ہے اور میں رشک و حسد کی آگ میں جل رہا ہوں۔

---

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

جراحت = چیر پھاڑ (آپریشن)
خونچکاں = خون میں ڈوبی ہوئی
مژگانِ سوزن = سوئی کی نوک

مطلب : ——— یہ ایک حقیقت ہے کہ جب سوئی سے زخم کو سیا جاتا ہے تو وہ خون آلودہ ہو جاتی ہے۔ اسی سچائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ اے محبوب جس وقت میرا وہ زخم جو تیری ذات کا نتیجہ تھا سیا جا رہا تھا تو سوئی بھی خون کے آنسو رو رہی تھی۔ لیکن افسوس کہ تو اتنا بے رحم اور سنگدل ہے کہ تیری آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ تک نہ نکلا۔ گویا فولاد کا دل یہ منظر دیکھ کر پانی پانی ہو گیا لیکن تجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

---

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

مطلب : ——— اپنے ہاتھوں کی بے چینی اور اضطرابی کیفیت کو خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہتے ہیں کہ میرے ہاتھ عالمِ فراق میں چین سے نہیں رہتے۔ جب میرا محبوب مجھ سے رخصت ہونے لگتا ہے تو اس کا دامن پکڑ لیتے ہیں اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو میرا ہی گریباں چاک چاک کر دیتے ہیں۔

---

ابھی ہم قتل گہہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

| | |
|---|---|
| شناور | ۔ تیرنے والا |
| جوئے خوں | ۔ خون کی نہر |
| توسن | ۔ گھوڑا |

مطلب : ——— تو وہ سفاک اور ظالم ہے کہ جب قتل و خوں ریزی پر آمادہ ہوتا ہے تو خون کی ندی بہنے لگتی ہے اور اس میں تیرا گھوڑا

برنے لگتا ہے۔ چوں کہ ہم نے اس منظر کو اب تک نہیں دیکھا ہے اس لیے یہ منظر کو دیکھنا آسان سمجھتے ہیں۔
اس شعر میں مبالغہ ہے۔ تنہا ایک شخص کا اس قدر قتل و خونریزی کرنا یا خون کی ندی میں کسی گھوڑے کا تیرنا ممکن نہیں ہے۔

---

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

کاں = کان
(کان کو اس طرح بلا اعلانِ نون استعمال کرنا درست نہیں ہے)
جنبشِ جوہر = جوہر کی حرکت
آہن = لوہا

مطلب :۔ —— جب عشق و محبت میں میری دیوانگی حد سے تجاوز کر گئی اور یہ طے پایا کہ میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی جائے تو ہر طرف میری دیوانگی کا چرچا ہونے لگا۔ یہ خبر لوہے کے کان تک بھی پہنچی۔ چنانچہ اس کے جوہر میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے خود ہی زنجیر کی شکل اختیار کر کے میری دیوانگی کا استقبال کیا۔

---

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

مطلب : —— میں اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوں کہ میں ازلی بد نصیب ہوں اس لیے میرے کھیت پر اگر سو بار بھی ابر آئے تو مجھ کو یہ دیکھ کر مطلق خوشی نہیں ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ جب فصل پک کر تیار ہو جائے گی اور خرمن کی شکل اختیار کرے گی تو اس پر یکایک بجلی دگر پڑے گی اور اس

کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ اسی مفہوم کا ایک اور شعر پہلے کہہ چکے ہیں۔
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے ؛ خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

---

وفاداری بشرطِ استواری ، اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو گاڑو کعبے میں برہمن کو

بشرطِ استواری = مضبوطی اور استحکام کی شرط کے ساتھ
اصلِ ایماں = ایمان کی بنیاد

مطلب : ——— کسی ایک عقیدے پر مضبوطی اور استحکام کے ساتھ زندگی گزارنا اور اس پر وفاداری کے ساتھ قائم رہنا ہی ایمان کی دلیل ہے گویا اپنے عقیدے کے ساتھ وفاداری کرنا اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہی ایمان کی بنیاد ہے۔ اس دعوے کی روشنی میں غالب کہتے ہیں چوں کہ ایک برہمن نے اپنے عقیدے میں اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے عقیدے کے ساتھ ہمیشہ وفاداری برتی ہے اور اس پر ہمیشہ ثابت قدم رہا ہے اس لیے اگر وہ بت خانے میں دم توڑ دے تو اس کو کعبے میں دفنا دینا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں بیان کرتے ہیں :

"جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مرے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے کیوں کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے۔"

---

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

مطلب :—— چوں کہ پہلے ہی سے میری تقدیر میں شہادت لکھی ہوئی تھی اس لیے میری بھی عادت (خو) بن چکی تھی کہ جب کبھی مجھ کو تلوار نظر آتی میں اپنی گردن اس کے آگے جھکا دیتا۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مطلب :—— مال و زر ذہنی پریشانیوں کا سبب ہوتے ہیں جب تک یہ انسان کے پاس رہتے ہیں خوف و ہراس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ غالب رہزن کو اس شعر میں اس لیے دعا دے رہے ہیں کہ ان کے پاس جو کچھ تھا اس نے دن کے اجالے میں اسے لوٹ لیا۔ اب لٹ جانے کا کوئی خوف نہیں ہے اس لیے آرام و سکون کی نیند آئے گی۔

---

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

سخن = شعر
جویاں ہوں = تلاش کریں
جواہر = قیمتی پتھر
معدن = وہ مقام جہاں سے قیمتی پتھر، سونا، چاندی یا کوئی دھات نکلے

مطلب :—— ہم کو قدرت نے وہ ملکہ عطا کیا ہے کہ ہم جواہر سے زیادہ انمول اور قیمتی اشعار کہہ سکتے ہیں اس لیے معدن کو کھود کر جواہر کی تلاش ہمارے نزدیک کارِ عبث ہے۔ گویا جگر کاوی کر کے عمدہ اور بہترین اشعار کی تخلیق کرنا معدن کھود کر جواہر نکالنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لیے کہ جواہر

کے کھو جانے، لٹنے اور برباد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لیکن اچھے اشعار ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔

---

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو۔

مطلب: —— ایران کے قدیم اور عظیم المرتبت بادشاہ فریدوں، جم کیخسرو، داراب اور بہمن کے مقابلے میں میرا ممدوح شاہ سلیمان جاہ عالی مقام، بلند مرتبہ اور فضیلت والا ہے۔ ان بادشاہوں کی میرے ممدوح کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔

—— ۵ ——

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

مطلب: —— یہ شعر لکھنوی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں غالب نے اپنے محبوب کی شوخی و شرارت کی عکاسی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں اس سیم تن (یعنی اپنے محبوب) کے پانو لگن میں رکھ کر دھوتا ہوں تاکہ اِس مبارک پانی کو پیوں، تو وہ ضد سے پانو لگن کے باہر نکال لیتا ہے تاکہ اس میں پانی جمع نہ ہونے پائے اور میں اسے پی نہ سکوں۔ اس طرح میں اپنے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہوں۔

---

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

کوہکن — فرہاد، شیریں کا عاشق۔
کوہکن کے پانو پڑوں — کوہکن کا احترام کروں

بہات ۔ افسوس
پیرزن ۔ بوڑھی عورت

مطلب : ——— اس شعر میں تلمیح ہے۔ اس میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ——— جب کوہکن خسرو بادشاہ کے حکم کے مطابق جوئے شیر، قصر شیریں تک لانے میں کامیاب ہو گیا تو خسرو بہت پریشان ہوا۔ چونکہ وعدے کے مطابق بادشاہ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ شیریں کو کوہکن کے حوالے کر دے۔ لہٰذا اس سے بچنے کے لیے اس نے ایک بوڑھی عورت کے ذریعے کوہکن کے پاس یہ خبر بھجوائی کہ شیریں کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی کوہکن حواس باختہ ہو گیا اور اس تیشے کو اپنے سر پر مار لیا جس کے ذریعے اس نے قصر شیریں تک دودھ کی نہر کھودی تھی۔

چونکہ کوہکن نے مرگِ شیریں کی خبر سن کر انتہائی سادگی سے جان دی تھی اس لیے غالب اس کا پاتو پڑتے ہیں یعنی اس کا احترام کرتے ہیں اور اس بوڑھی عورت کو یہ کہہ کر بد دعا دیتے ہیں کہ افسوس اس بوڑھی عورت کے پاتو کیوں نہ ٹوٹ گئے جس نے کوہکن تک یہ جھوٹی خبر پہنچائی تھی اور جس کے مکر و فریب کا شکار ہو کر اس نے اپنی جان دی تھی۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاتو

مطلب : ——— ہم رہزن سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگتے رہے۔ اب جو پکڑے گئے اور اسیر ہوئے تو اس کی یہ سزا بھگتنی پڑ رہی ہے کہ ہمیں رہزن کے پاتو دابنے پڑ رہے ہیں۔ گویا ہم جس مصیبت سے گھبرا رہے تھے وہی گلے پڑ گئی۔ اس شعر میں سوائے قافیہ پیمائی کے کوئی خاص بات نہیں ہے۔

---

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانو

فگار = زخمی

خستہ تن = تھکا ہوا جسم

مطلب: ـــــــ مجھے اپنے زخمی جسم کے لیے مرہم کی ضرورت تھی۔ میں اس کی تلاش و جستجو میں اتنی دُور دُور گھوما کہ میرے پانو میرے جسم سے زیادہ زخمی ہو گئے۔

---

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود، مرے اندر، کفن کے، پانو

ذوقِ دشت نوردی = صحرا صحرا یا جنگل جنگل گھومنے کا شوق

مطلب: ـــــــ مجھے زندگی بھر صحرا صحرا یا جنگل جنگل گھومنے کا اس قدر شوق رہا ہے کہ مرنے کے بعد بھی میرے پیروں کی حرکت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور وہ کفن کے اندر خود بخود ہلتے ہیں۔ اس شعر میں بھی سوائے قافیہ پیمائی کے کچھ نہیں ہے۔

---

ہے جوشِ گل، بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

مطلب: ـــــــ بہار کا موسم ہے، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔ باغ میں اس کثرت سے پھول کھلے ہیں کہ جب پرندے درختوں سے اڑنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے پانو پھولوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس شعر میں موسم بہار کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔

---

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

بتِ نازک بدن = محبوب

مطلب: ——— محبوب کے پانو کی تکلیف کا سبب یہی ہے کہ وہ رات کو خواب میں کسی سے ملنے گیا ہوگا۔ ورنہ پانو کا دکھنا کیا معنی جب کہ رات اس نے اپنے گھر ہی میں گزاری ہے۔

---

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

مطلب: ——— چونکہ میں "خسروِ شیریں سخن" سے حد درجہ عقیدت و محبت رکھتا ہوں اس کے پانو دھو کر پیتا رہتا ہوں، اس کا احترام کرتا ہوں اس لیے میرا کلام پُر اثر اور پُر لطف ہو گیا ہے۔

——— ۴ ———

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

ہولِ دل = دل کی گھبراہٹ، اختلاجِ قلب
شرمسار = شرمندہ

مطلب: ——— کہتے ہیں کہ محبوب کے دل میں رہ رہ کر جو گھبراہٹ ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ اس شرمندگی کی یہ وجہ ہے کہ میرا یہ گمان ہے کہ یہ گھبراہٹ میری آہ کی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ محبوب نے مجھ پر ستم ڈھایا اور میں نے صبر کیا۔ چنانچہ یہی صبر اس پر بجلی بن کر گرا ہے اور یہی اس کے اختلاجِ قلب کا سبب بن گیا ہے۔ اس لیے اگر وہ اس مصیبت میں مبتلا ہے تو میں بھی شرمندہ و پشیمان ہوں۔

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

تاکہ = جب تک

دیدۂ نخچیر = شکار کی آنکھ (یہاں عاشق کی آنکھ مراد ہے)

مطلب : ـــــــ معشوق کے ذوقِ ستم کی یہ انتہا ہے کہ وہ آرائش و زیبائش کے وقت اپنا چہرہ آئینہ میں نہیں دیکھتا بلکہ عاشق کے روبرو چہرہ کرکے بنتا اور سنورتا ہے اور اس پر ستم کے پہاڑ توڑتا رہتا ہے۔

---

۵

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

پئے ہم = پیہم، مسلسل

صدرہ = سو سو طرح سے (سو سو زمیں)

آہنگ = مقصد، ارادہ

مطلب : ـــــــ ہم کو معشوق کے کوچے میں پہنچ کر جو مسلسل غش آرہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم اپنے قدموں کو سو سو طرح سے بوسہ دیتے رہے اس لیے کہ وہ ہمیں کوچۂ معشوق تک لے آئے ورنہ ہمارا اس کوچہ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا ـــــ اس شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوچۂ معشوق تک جو راستہ گیا ہے ہم نے اس راستے کا ہر قدم پر طرح طرح سے بوسہ لیا ہے۔ یہ اسی ریاضت کا نتیجہ ہے کہ جب ہم محبوب کے کوچے میں پہنچے تو مسلسل غش آنے لگا۔

---

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

مطلب : ـــــــــ دل اور میں دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ محبت کے معاملے میں نہ دل میرا پیچھا چھوڑتا ہے اور نہ ہی میں دل کا پیچھا چھوڑتا ہوں۔ یہ اسی مشترک شوق کا نتیجہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو وفا کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ اس کمندِ شوق میں ہم دونوں ایک ساتھ گرفتار ہیں۔

---

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

ضعف = کمزوری
نقشِ پئے مور = چیونٹی کے پیروں کا نقش
طاقتِ رم = بھاگنے کی طاقت
طوقِ گردن = گردن کا پٹہ یا حلقہ

مطلب : ـــــــــ ہماری کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہم ایک چیونٹی کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی چیونٹی ہماری گردن پر بیٹھ جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے گردن میں طوق ڈال دیا ہے۔ چنانچہ کمزوری کی ایسی حالت میں ہم ترے کوچے سے کس طرح راہِ فرار اختیار کر سکتے ہیں۔ دراصل اب ہم میں بھاگنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔

---

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

نگاہِ غلط انداز = ایسی نگاہ جس سے بیگانگی ظاہر ہو
سم = زہر

مطلب : ـــــــــ آپ کو ہم سے بے اعتنائی برتنے کا مکمل اختیار ہے لیکن اس معاملے میں کم از کم اتنا تو خیال رکھیے کہ ہم کو اپنا عاشق سمجھ کر

بے اعتنائی برتا کیجیے تاکہ اس بات کی امید قائم رہ سکے کہ ایک نہ ایک دن آپ ہم کو مہربانی کی نظروں سے ضرور دیکھیں گے۔ آپ کا بیگانگی کی نگاہ سے ہماری طرف اس طرح دیکھنا زہر سے کم نہیں ہے چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ ہماری ہلاکت و بربادی ہے۔

---

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دودم ہے ہم کو

ہم طرحی = ایک جیسا
دردِ اثرِ بانگِ حزیں = غمگین آواز کے اثر کا درد
نالۂ مرغِ سحر = صبح کے مرغ کی آہ وزاری
تیغِ دودم = دودھاری تلوار

مطلب: ـــــــ ہم پر صبح کے مرغ کی آہ وزاری دودھاری تلوار کا کام کرتی ہے اور ہم اس کے دونوں رخ سے زخمی ہوتے ہیں۔ پہلا زخم تو اس بات سے لگتا ہے کہ مرغِ سحر ہماری ہی طرح نالہ و فریاد کیوں کرتا ہے۔ گویا وہ ہمارا ہم زبان کیسے ہوا اور دوسرا زخم یہ سوچ کر لگتا ہے کہ اس کی غمگین آواز میں اس قدر تاثیر اور درد کیوں ہے۔

---

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

مکرر = دوبارہ

مطلب: ـــــــ محبوب نے عاشق سے اس کا سر اڑانے کا وعدہ کیا تھا۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو عاشق نے پھر وعدہ پورا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر ہنس کر اس نے یہ جواب دیا کہ تیرے سر کی قسم

ہم تیرا سر ضرور اڑائیں گے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ تیرے سر کی قسم ہم تیرا سر ہرگز نہیں اڑائیں گے۔ وہ تو ہم نے ازراہ مذاق سر اڑانے کی بات کہی تھی۔

---

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو

ناچار = مجبور

پاسِ بے رونقیِ دیدہ = آنکھوں کی بے رونقی کا خیال

مطلب: ———— ہماری آنکھیں اس وقت ہی پُررونق رہتی ہیں جب ان میں خون کے آنسو ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے انتہائی فخر اور اہمیت کی بات ہے۔ چنانچہ یہی خیال کرکے ہم مجبوراً اپنے دل کا خون کررہے ہیں تاکہ ہماری آنکھیں ہمیشہ اشکِ خونیں سے لبریز رہیں اور ہماری یہ خوبی برباد نہ ہونے پائے۔

---

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

مطلب: ———— ہمارے اور تمہارے بیچ تعلقات کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں جب کہ ہم دونوں کی فطرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ تمہاری نازک مزاجی کا یہ حال ہے کہ اگر میں کسی وجہ سے خاموش رہتا ہوں تو تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری یاد میں نالہ و فریاد کررہا ہوں۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ تمہارے ستم سے گھبرا چکا ہوں۔ اس پر تمہارا تغافل اور جان لیوا ثابت ہورہا ہے۔

---

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مطلب: ـــــــــ یہ تینوں شعر غالبؔ کی زندگی کے ایک تاریخی واقعے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے مضمون کے لحاظ سے مسلسل ہیں۔ ہوا یہ کہ غالب اپنی پنشن کے سلسلے میں ۱۸۲۶ء میں دلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے اس سفر کے درمیان انہوں نے لکھنؤ میں قیام فرمایا اور یہ غزل کہی۔ چنانچہ اس کے اخیر میں انہوں نے اپنے سفر کے مقصد کو ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ آنے سے ہماری غرض سیر و تفریح نہیں ہے اس لیے کہ ہم کو سیر و تماشا کی ہوس ہی نہیں ہے۔ ہم جس مقصد کیلئے گھر سے نکلے ہیں اس کا اختتام بھی اس شہر پر نہیں ہوتا۔ دراصل سیر و تفریح کے متعلق ہمارا منتہائے نظر تو نجفِ اشرف کی مقدس سرزمین اور خانۂ کعبہ کا طواف ہے۔ اس لیے یہ سفر سیر و تفریح کی غرض سے نہیں کیا جا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اس سفر کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم ایک امید کے بھروسے یہ راستہ طے کر رہے ہیں۔ ہمیں کسی سے کرم کی امید ہے اور اس کرم کے کاف میں وہ کشش ہے جو ہم کو اس سفر پر آمادہ کر رہی ہے۔

ـــــــــ ۸ ـــــــــ

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مطلب :۔۔۔۔۔ اگر تمہاری رقیب سے رسم و راہ ہے تو اس پر مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہے بے شک یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اور میں اس میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا لیکن آپ میری طرف بھی کبھی کبھی مہربانی کی نظروں سے دیکھ لیا کیجیے تاکہ مجھ کو بھی سکون ملتا رہے اس طرزِ عمل سے آپ پر کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا یا آپ پر کوئی آفت یا مصیبت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔ اس لیے از راہِ ہمدردی کبھی کبھی میری بھی خیریت معلوم کر لیا کیجیے۔

---

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

مواخذہ = باز پرس

روزِ حشر = قیامت کے دن

مطلب :۔۔۔۔۔ یہ تسلیم کہ میرا قتل تمہارے ہاتھوں نہیں ہوا ہے بلکہ رقیب نے مجھ کو قتل کیا ہے۔ اس کے باوجود بھی میدانِ حشر میں اس جرم سے تمہارا بچ نکلنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ میرے قتل کا سبب تمہاری ہی ذات ہے۔ تم ایک ایسا مرکز ہو کہ رقیب اور میں، دونوں تم پر عاشق تھے۔ اسی رقابت میں رقیب نے میرا قتل کیا ہے اور اس قتل کے تم ہی تنہا گواہ ہو۔ چنانچہ حشر کے دن تم سے بھی باز پرس ہوگی۔

---

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

بے گنہ کش = بے گناہوں کی جان لینے والے

حق ناشناس = حق کو نہ پہچاننے والے

| | |
|---|---|
| بشر | = انسان |
| خورشید | = سورج |
| ماہ | = چاند |

مطلب : ـــــــ تمہارا یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ تم انسان نہیں ہو بلکہ آپنے حسن و جمال کے اعتبار سے سورج اور چاند کی طرح ہو اس لیے کہ سورج اور چاند کی فطرت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ بے گناہوں کی جان لیں اور لوگوں کے حق کو نہ پہچانیں ۔ ان کی ضیا پاشیاں تو سب پر یکساں ہیں اور تمہارا یہ حال ہے کہ تم بے گناہ لوگوں کی جان لیتے ہو اور حقداروں کو ان کا حق نہیں دیتے ۔

---

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

مطلب : ـــــــ یہ سوچ کر رشک سے میری جان پر بن آئی ہے کہ ان کے نقاب میں جو ابھرا ہوا ایک تار نظر آرہا ہے کہیں وہ رقیب کی نگاہ تو نہیں ہے جو اس طرح نقاب پر جم کر رہ گئی ہے ۔ گویا یہ بات غالب کی برداشت سے باہر ہے کہ ان کے محبوب کی طرف کوئی نگاہ اٹھا کر دیکھے ۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو

مطلب : ـــــــ اس شعر کا شمار غالب کے بلند پایہ اشعار میں ہوتا ہے اس کی شرح مولوی سید حیدر طباطبائی اس طرح کرتے ہیں :
" جس جگہ لطفِ زندگی تھا ، جب وہی چھٹ گئی تو پھر اب کہیں جانے کا انکار نہیں رہا ۔ "

مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی لکھتے ہیں :

"خوشی تو میکدے کی تھی لیکن جب وہیں نہ رہ
پائے تو بادل ناخواستہ جہاں کہیے پڑ کر دن گزار دیں۔"

اور مولانا الطاف حسین حالی نے یہ مطلب نکالا ہے :

"اس شعر میں ازراہِ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا
جس کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار
دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب میکدہ ہی چھٹ گیا
جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا
تو اب مسجد میں ملے یا مدرسے میں ملے یا خانقاہ
میں۔ سب جگہ پی لینی برابر ہی ہے۔ مسجد و خانقاہ
کی تخصیص ازراہِ شوخی کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات
جو اس شغل کے لیے بالکل موزوں نہیں ہیں۔
میکدہ چھٹنے کے بعد وہاں بھی پی لینے سے انکار
نہیں ہے۔ شعر میں شراب پینے کی تشریح نہ کرنا
عین مقتضائے بلاغت ہے۔"

ہمارے نزدیک اس شعر کا یہ مطلب ہے کہ اس میں غالب برائی سے اچھائی کی طرف یا شر سے خیر کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ ترکِ شراب نوشی کے بعد جب میکدہ چھوٹ گیا اور ان کی طبیعت خیر کی جانب مائل ہوئی تو انہیں مسجد، مدرسہ اور خانقاہ یاد آئی۔ یہ تینوں مقامات اصلاحِ نفسِ شریر کے مرکز ہیں چنانچہ ان میں سے کہیں بھی قیام کیا جائے، سوائے فائدے کے نقصان نہیں ہے۔ جب شراب نوشی کی بری عادت تھی تو ایک ہی جگہ یعنی میکدے میں مقید تھے اور اب یہ قید باقی نہیں رہی۔ آزادی سے مسجد، مدرسہ یا خانقاہ میں گزر بسر ہو سکتی ہے اور ان تینوں میں سے کہیں بھی

اضافہ ہو سکتی ہے۔

---

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

مطلب: ـــــ جنت کی جو تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جنت ہمارے لیے اس وقت ہی دلچسپی کا سبب ہوگی جب وہاں ہمیں تیرا جلوہ دکھائی دے۔ اگر تیرا جلوہ نظر نہ آیا تو پھر جنت ہمارے کس کام کی۔

---

غالب کبھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

ضرر = نقصان

مطلب: ـــــ اس شعر میں غالب اپنے ممدوح (بہادر شاہ ظفر) کو درازیِ عمر کی دعا دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے خدا جب تک یہ دنیا قائم ہے میرا بادشاہ زندہ و سلامت رہے تاکہ اس کی ذات سے دنیا کو فیض پہنچتا رہے۔ اگر میں دنیا میں زندہ بھی رہا تو دنیا یا اہلِ دنیا کو میری ذات سے کیا فائدہ پہنچنے والا ہے لیکن میرے بادشاہ کی ذات تو فیض رساں ہے۔

---

۹

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

مطلب: ـــــ ہم پر محبوب کی بے التفاتی اور بے وفائی اچھی طرح ظاہر ہو چکی ہے جب بار بار کہنے کے باوجود بھی اس کی مہربان نظر یں

ہماری مطلب نہیں انھیں اور انکسے نے ہم سے بات کرنا گوارا نہیں کیا تو آخر پھر کہنے کا کیا نتیجہ نکلے گا اس لیے اس سے التجا کرنا ہی بیکار ہے۔ اب ہمارے دل میں یہ آرزو ہی باقی نہیں رہی کہ اس سے گفتگو کی جائے۔

ہمارے ذہن میں ہے اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

وصال = ملاقات ہونا، مِل جانا

مطلب: محبوب سے ملاقات کا ہونا ایک ناممکن امر ہے اس لیے ہم نے اس فکر کا نام وصال رکھ لیا ہے کہ اگر محبوب سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو تو کہاں جائیں، کیا کریں اور کس طرح اس درد کا مداوا کریں یا اس سے ملاقات کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں گویا ہم نے اسی فکر کو اپنا وظیفہ بنا لیا ہے۔ ہم دن رات اسی خیال و تصور میں مست و بیخود رہتے ہیں اور اسی سے وصال کے مزے لوٹتے رہتے ہیں۔

---

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو۔

مطلب: ——— یہی کشمکش اور یہی گومگو کا ٹکڑا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس شعر کا تعلق اگلے شعر سے ہے جس میں کشمکش کی کیفیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی اگر محبوب کا وصل میسر نہ ہو تو کہاں جائیں، کیا کریں، یا وصل کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں۔ شاعر اسی کشمکش کا شکار ہے۔ چنانچہ اس شعر میں وہ کہتا ہے کہ ادب کا تقاضہ کچھ اور ہے اور وصلِ محبوب کی کشمکش کا تقاضہ کچھ اور تو آخر بات کس طرح بنے گی۔ اسی طرح حیا کچھ اور چاہتی ہے اور یہ گومگو (کشمکش) کچھ اور تو ایسی صورت میں

وصالِ محبوب کس طرح بسر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جب وصل ممکن ہی نہیں ہے تو ہم اس کے تصور و خیال کو ہی وصل کا نام کیوں نہ دیں۔ یہی سوچ کر ہم نے اس فکر کا نام وصال رکھ دیا ہے۔ اس طرح یہ دونوں شعر ہمارے نزدیک قطعہ بند ہیں۔

---

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

صنم پرستوں کا = بتوں کے چاہنے والوں کا (عاشقوں کا)
بت = معشوق

مطلب: ـــــــ اگر دنیا کے تمام معشوقوں کی عادت تمہاری ہی طرح ہو یعنی وہ تمہارے ہی جیسے سنگدل، بے وفا اور بے رحم ہوں تو پھر عاشقوں کا گزارا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان کی زندگی تو دوبھر ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام عاشق ناکام و نامراد نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تم اس معاملے میں سنگدل اور بے وفا ہو۔

---

الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

مطلب: ـــــــ تمہیں تو اپنے حسن پر اس قدر ناز ہے کہ آئینے میں تم اپنا ہی عکس دیکھ کر اس سے الجھنے لگتے ہو۔ گویا تم اپنے عکس کو بھی اپنے مانند دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ اگر شہر میں تمہارے جیسے ایک دو حسین اور موجود ہوں تو ہمیں یقین ہے کہ تم آئے دن ایک نیا جھگڑا کھڑا کر دو گے۔
مندرجہ ذیل شعر غالب کے اس شعر کو ایک حد تک واضح کرتا ہے اور مفہوم کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

غرور اس کی طبیعت کا خاص حصّہ ہے
تم احتیاط سے کمرے میں آئینہ رکھنا

---

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

روزِ سیاہ = تاریک دن (یہاں بدنصیبی مراد ہے)

مطلب: ـــــــ جس شخص کے مقدر میں میری جیسی بدنصیبی لکھی ہوئی ہے یعنی رات کی طرح اس کا دن بھی تاریک ہے تو اس شخص کو رات کی سیاہی دن کی طرح نظر آئے گی اور وہ اپنی رات کو یقیناً دن ہی سے تعبیر کرے گا۔ گویا اس شخص کا تاریک دن، رات کے مقابلے میں اتنی قدر تاریک ہے جس قدر دن کے مقابلے میں رات تاریک ہوتی ہے۔ چنانچہ جو شخص میری طرح بدقسمت ہے اور جسے ایسا ہی تاریک دن نصیب ہے تو اس کے نزدیک دن، رات کے برابر ہے یعنی اس کے لیے رات اور دن دونوں برابر ہیں۔

---

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھے نہ وو تو کیوں کر ہو

وو = وہ

مطلب: ـــــــ جب وہ ہماری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تو کس طرح یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ہماری قدر و منزلت کریں گے اور ہماری جانب بنظرِ التفات دیکھیں گے اس بات سے ہم بالکل ناامید ہو چکے ہیں اس لیے مطمئن ہیں کہ ان کا ہماری قدر و منزلت کرنا ممکن نہیں ہے۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

دیدۂ دیدار = دیکھنے والی آنکھیں

مطلب: ——— ہمیں یقین تھا کہ ان کا خط ضرور آئے گا جو ہمارے بے چین دل کے لیے سکون کا باعث ہوگا۔ لیکن ہماری مضطرب آنکھیں اس خیال سے مطمئن نہیں تھیں۔ وہ روزانہ محبوب کے خط کا بے چینی سے انتظار کرتی رہیں۔ لہٰذا تسلی کیونکر ہو سکتی تھی۔

---

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مژہ = پلک
نیش = ڈنک، نوک
فرو = پیوست

مطلب: ——— محبوب کی اس مژہ کو جس کی نوک نشتر کی طرح ہے خود دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ مجھ کو کس طرح سکون و قرار مل سکتا ہے جبکہ میرے رگِ جاں میں وہ تیز نشتر کی طرح پیوست ہو چکی ہے۔

---

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

مطلب: ——— غالبؔ نے یہ غزل بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر کہی تھی اور مصرعِ طرح بھی انہیں کا دیا ہوا تھا اس لیے کہتے ہیں کہ میری بے چینی و بے قراری کا سبب جنوں نہیں ہے بلکہ حضور بادشاہ سلامت نے بذاتِ خود اس طرح کہا ہے:

## "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو"

۱۰

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

نوا سنجِ فغاں = آہ و فغاں کرنا، فریاد کرنا، گریہ و زاری کرنا

مطلب: ـــــــ کسی کو دل دے دینے کے بعد آہ و فغاں کرنا آدابِ محبت کے خلاف ہے۔ عاشق کو چاہیے کہ صبر و استقامت سے کام لے اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے دستورِ عشق یہی ہے کہ جب دل چلا جاتا ہے تو پھر لب پر مہرِ سکوت لگ جاتی ہے۔ اس لیے جب سینے میں دل ہی نہیں ہے تو منھ میں زبان بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرزِ عمل سے عشق درجۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

---

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وضع = طور طریقہ، عادت

سبک سر = ذلیل، کمینہ

سرگراں = ناراض

مطلب: ہم ان کی فطرت سے خوب اچھی طرح واقف ہیں اس لیے پورے یقین و اعتماد کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ان کی بے وجہ ناراض ہونے کی عادت میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ چنانچہ جب وہ اپنی عادت چھوڑنے والے نہیں ہیں تو ہم بھی اپنے طور طریقے کیوں بدلیں۔ ہمیں بھی اپنی انا اور خودداری عزیز ہے اس لیے ہم ان سے ان کی ناراضگی کا سبب دریافت

کر کے ذلیل و رسوا ہونا نہیں چاہئے۔ اگر وہ ناراض ہیں تو ناراض ہی سہی ہم انہیں منانے والے نہیں۔

---

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو

مطلب: —— غالب کے نزدیک ان کا غم ایک قیمتی سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس کو دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ وہ اس شعر میں اپنے غم خوار پر اسی لیے اپنے غم و غصّے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس نے ان کے غم کے راز کو فاش کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ غم خوار کی ایسی محبت کو آگ لگے کہ وہ میرے غم کی تاب نہ لا سکا اور بے اختیار آہ و فغاں اور گریہ و زاری کر کے لوگوں کو میرے غم سے باخبر کر دیا۔ جب اس میں غم کو برداشت کرنے کی قوت نہیں تھی تو وہ میرا رازداں ہی کیوں بنا۔

---

وفا کیسی کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

مطلب: —— تجھ سے محبت کرنے کا یہی نتیجہ ہے کہ پتھر سے سر ٹکرا کر اپنی جان دے دی جائے تو ایسی وفا اور ایسا عشق کس کام کا۔ جب تیری سنگدلی اور بے وفائی کا یہ حال ہے تو پھر اے سنگدل ہم تیرے ہی سنگِ آستاں سے اپنا سر کیوں پھوڑیں۔ تیرے دروازے پر اپنی جان کیوں دیں۔ اس لیے کہ اس کا نتیجہ بھی ہماری ذلت و رسوائی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ محبت کسی ایک سے کی جاتی ہے لیکن سر تو کسی بھی پتھر سے پھوڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارا دل جہاں چاہے گا وہاں اپنا سر پھوڑ لیں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ تیرے ہی سنگِ آستاں سے ہم اپنا سر پھوڑیں۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مطلب: ——— ایک پرندہ قفس میں قید تھا۔ اس نے قید کی حالت میں اپنے باغ میں بجلی کو گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس خیال سے وہ بے حد متاثر ہوا کہ خدا جانے اس کے آشیانے کا کیا حال ہوا۔ سلامت رہا یا جل کر راکھ ہو گیا۔ وہ اسی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا کہ اتفاقاً اسی باغ کا ایک آزاد پرندہ اس کے قفس کے سامنے ایک درخت کی شاخ پر آ بیٹھا۔ اس کو دیکھ کر اس نے چمن کا حال پوچھا اور یہ سوال کیا کہ کل بجلی گرنے سے کس کس کا آشیانہ تباہ و برباد ہوا۔ چونکہ آزاد پرندہ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ اس کا بھی آشیانہ بجلی گرنے سے جل چکا ہے لہٰذا وہ اس کے سوال پر خاموش رہا۔ یہ دیکھ کر قیدی پرندے نے اپنی بلند ہمتی اور اپنے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزاد پرندے سے یہ کہا کہ یہ سچ ہے کہ میں قید ہوں لیکن چمن کے حالات بیان کرنے میں خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو ایک آسمانی آفت ہے جو باغ پر نازل ہوئی ہے۔ اس میں تو سیکڑوں اور ہزاروں آشیانے ہیں اگر ایک میرا بھی آشیانہ جل کر راکھ ہو گیا تو اس کا کیا غم۔ اس لیے بے خوف ہو کر چمن کے حالات بیان کر۔

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

مطلب: ——— جب تم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو اور یہ اقرار بھی کر رہے ہو کہ "ہم دل میں نہیں ہیں" یعنی ہم اپنے آپ میں نہیں ہیں۔ ہم پر مستی و بے خودی کی کیفیت طاری ہے اور سوائے تمہارے

یاد کے ہمارے دل میں کوئی اور خیال نہیں ہے تو پھر بتلاؤ کہ تم ہماری آنکھوں سے پوشیدہ کیوں ہو۔ اقرارِ حقیقت کے باوجود بھی تم ہماری آنکھوں کے سامنے کیوں نہیں آتے۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

مطلب: —— میرے اور تمہارے بیچ یہ جو کشاکش پیدا ہو گئی ہے اس میں میرے جذبِ دل یعنی میری محبت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ کشاکش فقط تمہاری وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب میں تمہاری طرف اپنا قدم بڑھاتا ہوں تو تم مجھ سے دور بھاگنے لگتے ہو۔ میں جب اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوں تو تم میری طرف سے اپنا رخ پھیر لیتے ہو۔ تمہارے اسی طرزِ عمل سے کشاکش و نفرت کی یہ صورت پیدا ہو گئی ہے لہٰذا اس سلسلے میں میرے جذبِ دل کا شکوہ کرنا غلط ہے۔

---

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مطلب: —— جس طرح آسماں ستم پرور ہے اسی طرح تمہاری دوستی بھی ستم ڈھانے والی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ جس شخص کے ساتھ تمہاری دوستی ہو جاتی ہے وہ تمہارے پُر فریب چکر میں پڑ کر خود بخود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم جس کے دوست بن جاتے ہو اس پہ آسمان ظلم و ستم نہیں ڈھاتا۔

---

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

مطلب : ——— جب تم نے میرے رقیب (دشمن) کے ساتھ دوستی کر لی ہے اور اس کے ساتھ محبت کا اقرار اور عہد و پیماں ہو چکا ہے تو پھر میری محبت کا امتحان لینا کیا معنی؟ یہ تو سراسر شرارت ہے۔ اس کو امتحان لینا یا آزمانا نہیں کہتے بلکہ خود دانستہ ستانا اور پریشان کرنا ہے۔

---

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو"

مطلب : ——— عاشق اپنے محبوب کو رقیب سے رسم و راہ نہ رکھنے کی تلقین کر رہا ہے۔ اسے یہ کہہ کر سمجھا رہا ہے کہ اس کے ساتھ رہنے میں رسوائی اور بدنامی ہوگی۔ یہ سن کر محبوب اپنے عاشق سے یہ سوال کرتا ہے کہ رقیب سے ملنے میں کیوں رسوائی ہوگی۔ اب عاشق طنزیہ لہجے میں اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ آپ بالکل بجا اور سچ کہتے ہو۔ ذرا ایک بار پھر تو کہیے کہ رقیب سے ملنے میں رسوائی کیوں ہوگی۔

---

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

بے مہر = نامہرباں

مطلب : ——— کہتے ہیں کہ اے غالب اگر تو اپنے محبوب کو نامہرباں کہہ کر طعنہ بھی دے گا تب بھی وہ تجھ پر مہربانی نہیں کرے گا۔ وہ اس قدر سنگدل اور بے رحم ہے کہ تیرے اس طعنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

---

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مطلب: ـــــــ یہ اشعار قطعہ بند ہیں۔ ان میں غالب نے اپنے دلی جذبات کو تسلسل سے نظم کیا ہے۔ ان اشعار میں وہ دنیا اور اہلِ دنیا سے حد درجہ بیزار نظر آتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور تجربہ انہیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ اس خود غرض سماج میں نہ تو کوئی کسی کا دوست ہے اور نہ ہی کوئی غم خوار جب ہر شخص مطلب پرست، مفاد پسند اور غرض کا پجاری ہے تو سماج میں رہ کر کیا فائدہ۔ کیوں نہ اس مقام پر باقی ماندہ زندگی کے دن گزارے جائیں جہاں آدمی کا نام و نشان نہ ہو۔ نہ تو کوئی ہم سخن ہو اور نہ ہی ہم زباں۔ فقط تنہائی ہی تنہائی ہو۔

انسانی آبادی سے دور کھلی فضا میں مکان کی تعمیر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ جب مکان ہی نہیں ہوگا تو ہمسایہ اور پاسبان سے بحث و تکرار کی کوئی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ اس طرح آئے دن کے جھگڑوں سے جان چھوٹ جائے گی۔

پھر اگر بیماری نے آگھیرا تو وہاں نہ تو کوئی مزاج پرسی کے لیے آسکے گا اور نہ ہی کسی معالج سے واسطہ پڑے گا۔ اور اگر مر گئے تو مرنے کے بعد ہماری نعش پر کوئی نوحہ خوانی کرنے والا یا آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوگا۔

غالب نے یہ فیصلہ اہلِ دنیا کی منافقانہ روش کو دیکھ کر کیا ہے۔ وہ ان تمام

خیالات کو اپنے ایک شعر میں بڑی خوبصورتی سے نظم کر چکے ہیں:

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

# انتخاب پبلشنگ ہاؤس کی چند معیاری کتابیں

**معیارِ ادب**
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**گوبھی کے پھول**
(مزاحیہ شعری مجموعہ)
ناظم انصاری

**لگی**
(طنزیہ و مزاحیہ مضامین)
انصاری اصغر جمیل

**جوشاندہ**
(مزاحیہ شعری مجموعہ)
جملوا انصاری

**حرا کی روشنی**
(نعتیہ مجموعہ)
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**واردات**
ایک مطالعہ
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**شرح کلامِ غالب**
(ردیف واؤ)
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**رعنائی خیال**
(شرح ادبی پارے نظم)
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**شرح اشعارِ مومن**
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**شرح قصیدہ مدیح خیر المرسلین**
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**سیمیں اور ان کے مضامین**
ڈاکٹر شرف الدین ساحل

**مشاہیر کے خطوط ڈاکٹر ساحل کے نام**
انصاری اصغر جمیل

○ تقسیم کار ○

**صالحہ بک ٹریڈرس**
جامع مسجد
مومن پورہ - ناگپور ۴۴۰۰۱۸

**حنیف بک ڈپو**
مومن پورہ
ناگپور ۴۴۰۰۱۸

طباعت: اصغر فائن آرٹس - جامع مسجد - مومن پورہ - ناگپور ۴۴۰۰۱۸